

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

اشارات

مسلم ہونے اور تحریک اسلامی کا علمبردار اور دعوت حق کا گواہ بننے کے لیے شرط لازم یہ ہے کہ کلمہ طیبہ پڑھتے ہی آدمی خدا سے واحد کے سوا سارے آلہہ و طواغیت کا انکار کر دے۔ سب سے مشکل کام نفس کے اللہ کا انکار ہے۔ پھر بیوی بچوں اور خاندان کے الہوں کا انکار ہے۔ پھر ماحول کی رسمیات کے پورے مذہب اسراف و بدعت سے انکار ہے۔ جو شخص راہ حق میں خلوص و صدفی دلی سے نکلے اُس کے لیے راستہ یہی ہے کہ وہ مختلف الہوں کی لازم کردہ شریعت رسوم سے بغاوت کے لیے تیار ہو، ورنہ جسے ہر طرف بنا کے رکھنی ہو، اس کے لیے دین کی سر بلندی کا کام کرنے والوں میں اگھنا بعد میں خود اسے پریشان کرے گا۔

چنانچہ سید احمد شہیدؒ نے اپنی تحریک کا آغاز ہی اصلاح رسوم اور انسداد بدعات سے کیا تھا۔ اسی طرح مولینا اشرف علی تھانویؒ نے بھی اس میدان میں بڑا کام کیا۔ آج بھی جس کسی کہ دین کی خدمت کرنی ہے، اُسے رسوم و بدعات کی زنجیریں توڑنی ہوں گی اور اس کام کا آغاز ہمیشہ اپنی ذات سے ہوتا ہے۔

ہم پہلے ہمارے دور بادشاہت نے باہر کے اثرات لاکے ڈالے۔ پھر ہندو اور مسلمانوں کے رواج ہمارے تقادیب میں گھس گئے اور اب مغربی معاشرہ و تمدن کے اثرات راستہ بنا ہے۔ تمام غلط بیرونی اثرات سے نکلنے کے لیے ایک مہم ضروری ہے اور شاید شادی بیاہ کے معاملے میں سب سے پہلے اصلاحی کام ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں معاشرے کے سامنے ہر جھکا دینے کے بعد پھر آپ تبلیغی جماعت کی طرح کا کام

کہہ سکتے ہیں، طاغوتوں اور منکرات کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے اقامتِ دین کا بھرپور کام نہیں کر سکتے۔

محترم قاضی حسین احمد قسیم (کالعدم جماعت اسلامی) نے پچھلے دنوں ایک تقریر میں شادی بیاہ کو فضولیت سے پاک کرنے کے جو اصولی دعوت کارکنوں کو دی ہے، اُس کا علم ہوتا ہے مجھے بے حد مسرت ہوئی۔ میں جہاں ایک طرف شادیوں اور ولیموں کے نئے پرشکوہ ڈراموں کو دیکھ دیکھ کر اتنا دیگر تھا کہ کئی بار خیال کیا کہ کسی شادی میں سرے سے شرکت ہی نہ کی جلتے۔ اور دوسری طرف جب میرے دل میں تحریک کے بہانہ دور کی یہ اجتماعی آئینہ جاگ اُٹھی کہ جس طرح دوسرے معاملات میں ہمیں سرگرم ہونے میں شریعت کے گندے سمندر سے ایک نئے پاکیزہ جزیرے کو ابھارنا ہے، اسی طرح شادی بیاہ کے معاملے میں بھی نئے طریقے اختیار اور رائج کرنے ہیں۔ جس دینی تحریک نے ہمیں بھائی بھائی بنا دیا ہے۔ آئندہ وہی ہمارے نئے تعلقات اور رسومات کی بنیادیں فراہم کرے گی۔ اس سلسلے میں کچھ کام بھی ہوا، مگر پھر ماحول نے وہ وہ چکر دیئے کہ سب کچھ فراموش ہو گیا۔ اور ہم نے معاشرے میں انتہائی متمدن پیدا کرنے کے بجائے رسمیات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ سو میرے لیے قاضی صاحب کا ایک ذرا سا جملہ سوتے ہوئے احساسات کو جگانے کا بہانہ بن گیا۔ لطیفہ کے طور پر کہنا ہو تو کہہ لیجیے کہ ”قاضی با قاضی می سازد“۔ مگر مجھے معلوم ہوا کہ قاضی صاحب

اے ہمارے حلقے سے وابستہ لوگوں نے ایسی بھی مثالیں قائم کی ہیں کہ دو بہا صاحب مردانہ طلائی زیورات سے مرصع ہو کر قشر لایع لائے اور لڑکی والوں کے متوسط الحال سے خاندان سے گن گن کر اسبابِ حدید کے مطالبے پورے کرانے لگے۔ ایسے تماشے بھی دیکھ کر لڑکی والوں کے ہاں کسی بند کو ٹھٹھری میں محض چھوٹی ڈھولک بچ رہی تھی، مگر عجب بارات کی آمد کا وقت ہوا تو لڑکیوں نے دوڑ بھاگ کر اُسے چھپانے کی کوشش کی کہ اسلامی طرز کی بارات ولے کیا رائے قائم کریں گے، مگر ستم یہ ہوا کہ اس اسلامی بارات میں سب سے پیش پیش بے پردہ عورتوں کی ایک ٹولی نکلی اور اُن کی سرغنہ صاحبہ نے اوپر پہنچ کر زور شور سے خود گانے بجانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ (سنجے جی)

کہ بہت سے تعمینی خطوط موصول ہوئے اور کارکنوں میں نہایت اچھا احساس ابھرا۔
میرا خیال یہ ہے کہ اب ہمیں اس میں دیر نہیں کرنی چاہیے اور کسی بالائی مشاورت میں اپنے
اصول و معیار دین کے مطابق مگر اعتدال پسندانہ طریق سے طے کر لینے چاہئیں۔ اور پھر امید کرنی
چاہیے کہ ہمارا کوئی رفیق یا حامی ان کا خلاف ورزی نہ کرے گا۔

آج کل جتنی چیزیں میں نے غلط شکل میں ہوتی دیکھیں ان سب کا اندر بڑے بڑے "اساطین"
نیک نے یہ بیان کیا کہ کیا کریں اب لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ملنے، یا بیوی یا برادری نہیں راضی ہوتی اس کے
معنی یہ ہیں کہ ایسے لوگ نہ اپنے گھر کے لیے کبھی تو "لامیڈ" بن کے رہے نہ انہوں نے بیوی بچوں
کی مائیں تیس برس میں کوئی تربیت کی اور نہ اپنی برادری پر اپنی اخلاقی فوقیت کا کوئی مسک
بٹھایا۔ دوسرے معنوں میں باہر تو وعظ کہے جاتے رہے، مگر اندر شیطان بدعات و رسمیات کا
محاذ بناتا رہا۔ ہمارے دوست اپنے گھروں کے اندر اپنے نظریات و مقاصد کے خلاف ایسے تباہ کن
محاذ بنتے اور پھیلنے ہوئے دیکھتے رہے اور کبھی انہیں احساس نہ ہوا کہ بہت سے آئندہ و طواغیت ان
کو ان کے اپنے گھر میں شکست دینے کے سامان کر رہے ہیں۔ اور آج تو شیطان مغربین کی بنیاد
پالیسی ہی یہ ہے کہ عورتوں کو ہنپاٹ کر کے اور بچوں کو تفریحات کی ٹافیاں کھلا کر اور جوان لڑکوں
اور لڑکیوں کو فحاشی و لذتیت کی ہیروئن کا عادی بنا کر مسلم گھروں کے ان قلعوں کو توڑ دیا جائے جن کے
فراہم کردہ تحفظ کی وجہ سے اسلامی تہذیب کے آداب و شعاں کسی نہ کسی طرح اب تک زندہ چلے آ رہے
ہیں۔ نیز گھروں میں بزرگوں، خصوصاً اسلامیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ماؤں، دادیوں، نانیوں اور
مچھو پھیوں کو اس حد تک بے بس کر دیا جائے کہ وہ نصیحت کرنا تو کجا، زندگی کے مشکل مرحلوں کو نہ جواں

لے مجھے اس تحریر کو لکھنے کے دوران میں یہ معلوم کر کے اور مسرت ہوئی کہ ہمارے رفقاء نے اصلاح
اسوال کے لیے ایک کمیٹی قائم کر دی ہے جو اپنی تجاویز مرتب کر کے دے گی۔ آنوی فیصلہ جو کچھ ہوگا، میں
اس کا ساتھ دوں گا۔ مگر اس وقت تو میں یہ تحریر بڑی عازم لکھ چکا ہوں، اور میرے خیال میں کوئی بات
خلاف اسلام اس میں نہیں ہے، یہ الگ بات ہے کہ تغیرات و ترمیمات میں دوسروں کی رائیں مجھ سے

(بہتر ہوں مگر صحت)

کے سہارے طے کرنے کے لیے کچھ غلط حرکات کو دیکھ کر خاموش بھی رہیں اور طنز و مسخرہ بھی برداشت کریں۔

میرے سامنے جب پہلے پہل کراچی کی بعض دولت مند تاجروں کی طرف سے شادی بیاہ کے لیے طے شدہ ضابطے آئے اور ان ضابطوں پر عمل بھی ہونے دیکھا اور سنا تو مجھے صدمہ ہوا کہ جو کام ہمارے کرنے کا تھا اور زیادہ معیاری اور بہتر طور پر کرنے کا تھا اس میں ایسے دوسرے لوگ بازی لے گئے جو دنیا دار کہلاتے ہیں۔

اپنے دل بھی خال خال مثالیں ایسی ابھریں کہ انہیں دیکھ کر دل سے بے اختیار دعائیں نکلیں، مگر ایک تو وہ شاذ ہیں، دوسرے ان کی غلبہ کو اس پر محمول کیا گیا کہ عزیز لوگ ہیں، حالات بہتر ہوتے تو یہ بھی سب کچھ کر گزرتے۔ مگر میں اپنے بعض دوستوں اور رفیقوں کو جانتا ہوں کہ وہ اصول اور مسلک ایک خاص طرز پر سوچنے والے ہیں۔ یہی لوگ ہمارا سرمایہ افتخار اور ہمارے لیے نمونہ ہیں۔

شادی بیاہ کے سلسلے میں منزلِ اول رشتے کی تلاش ہوتی ہے۔ لڑکا اگر پیسے والا ہو اور مشرق وسطیٰ میں سیال سونا رکھنے والے ممالک نے کتنے ہی ان پڑھ اور بد صورت لوگوں کو دولت مند بنا دیا ہے تو ماں بہنیں چراغ لے کر کسی ایسی چاند سے کھڑے کی تلاش میں نکل کھڑی ہوتی ہیں جس کے پیچھے پیچھے دولت کی ندی بھی بہتی چلی آئے۔ کہیں ان پڑھ لڑکوں سے ایم اے پاس لڑکیوں کا

اے اس مادہ پرست اور جسم پرست اور چہرہ پرست معاشرے میں سارا حسنِ بال اور کھال اور خدوخال ایک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ حالانکہ کتنے ہی سادہ اور سادہ سادے چہروں کے پیچھے خوش اخلاقی، دفا شعاری طاعت گزارہی اور حفظِ عصمت و ناموس کا ایک خزانہ محسن مخفی ہوتا ہے۔ ایک محسن ننگا ہونے کے لیے عارضی سامانِ فریب ہوتا ہے، دوسرا حسنِ ساری زندگی کو ٹپوڑ بنا دیتا ہے، مگر بگڑے ہوئے سطحی فحوق حسن کو تبدیل کون کرے۔

جوڑ لگا دیا جاتا ہے، کہیں بد صورت فوجرانوں سے انتہائی نرم و نازک لڑکیاں وابستہ کر دی جاتی ہیں۔ چھریہ ستم بھی ہوتا ہے کہ پینتالیس سال کا مرد کسی ۱۸ سال کی لڑکی کو شکار کر لے جاتا ہے اسی طرح لڑکی والے بھی یہ دیکھیں گے کہ لڑکے کے پاس پیسہ وافر ہے۔ ڈاکٹری، انجینی، اعلیٰ سرکاری عہدہ یا کوئی بڑا بزنس ہے، الگ گھر ہے، ساس نندوں سے ترسا بقہ نہیں پڑے گا وغیرہ حالانکہ سب سے پہلے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کوئی لڑکا یا لڑکی یا اُن کے گھر لے کر تحریکی لحاظ سے یا کم سے کم دیناری اور پردہ داری کے لحاظ سے کیسے ہیں۔ باقی ساری چیزیں علی الترتیب بعد میں دیکھنے کی ہو سکتی ہیں۔ اگر پہلی شرط معیار ہی طوط پر پوری ہو تو دوسری ساری ضروریات سے چشم پوشی کی جا سکتی ہے۔ گزربسر کے کم سے کم انتظامات اور عمارت تعلیم کے توازن و تناسب کو بھی دیکھنا ضروری ہے۔

حال یہ ہے کہ معاشرہ میں شادی مارکیٹ گو یا دورِ قیام کے شناس یا دارالرقیقین کی مانند ہے کہ نوٹیاں قطر در قطر رکھ رہی ہیں، دیکھیے، ٹٹولیے اور بھاؤ تاؤ کر کے مال منجھالیے۔

تحریک اسلامیہ اس قسم کی منادی سے نفرت کرتی ہے۔ اسلام اگر معیار ہو گا تو اس کی سوئی گھوم کر خود تباہی گئی کہ امکانی طوروں میں سے کدھر کا رخ کرنا چاہیے۔

علاوہ ازیں ان سب جعلی معیاروں کے ساتھ ساتھ خاندانی اور نسلی حدود بندوبست کی پرستش کرنے والے بھی موجود ہیں۔ چاہے لڑکی ساری عمر جہنم میں رہے یا لڑکا گھر کی فضا کے درد کا دھماکا آ رہا گری میں تلاش کرے، یا تعلیمی اور معاشی لحاظ سے آپس میں کبھی بات نہ بنے، ہر پھر کے مقررہ کو لہو میں دو افراد کو جو تنہا ضروری ہے۔

پڑائی جاہلیتوں میں سے ایک جاہلیت یہ کام فرما ہے کہ رشتے طے کرنے سے لے کر، جو پڑانے حلقوں میں اب بھی پچھن سے طے ہو جاتے ہیں، شادی اور اس کے سارے مقتضیات تک کو انحصار دھند طے کرنا بڑوں نے اپنے ذمے لے رکھا ہے، اور ان کے فیصلے گویا ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے سے ہوتے ہیں۔ کسی مرحلے پر بچوں سے کچھ پوچھنا، مشورہ لینا یا کسی واسطے سے اُن کا عندیہ معلوم کرنا تو بالکل خارج از بحث ہوتا ہے۔ مائیں جو اولاد کے رجحانات نسبتاً

زیادہ جان لیتی ہیں۔ وہ اقل قبول نہیں سکتیں اور بولیں تو لڑائی جھگڑے بلکہ مار دھاڑ کے سوا ان کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کو روایت کی گند پھری سے ذبح ہوتے ہوئے آنسوؤں بھری آنکھوں سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ ان کے سامنے جاہلی رواج کا قصائی چھری پھیر دیتا ہے۔

بدقسمتی سے اس طریقے کو شرعی سمجھ لیا گیا ہے کہ ماں باپ جو چاہیں کہ دیں، حالانکہ شریعت نے لڑکے کا معاملہ نواگ، لڑکی تک سے یہ پوچھنے کو لازم ٹھہرایا ہے کہ آیا وہ پیش نظر صورت میں راضی ہے۔ مگر اقل لڑکائی بھی مرد و جہا بلیت کے قص میں ہوتے ہوئے نفی میں جواب دینے کی جرات نہیں کر سکتی، لیکن اگر کرے (جس کی شاذ عملی مثالیں میرے سامنے ہیں) تو اس پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے، یہاں تک کہ وہ ماں کہہ دے۔ وہ ماں باپ کی عزت کے سامنے ہتھیار ڈال کر ساری عمر کی پینا سیل لیتی ہے۔

اس جاہلی طرز عمل کا رد عمل نوجوانوں کی طرف سے کسی دوسری جاہلیت کی شکل میں روتا ہوتا ہے۔ ایک تو پرانا طریقہ اغوا وغیرہ کا۔ اور دوسرے نیا طریقہ خاندانی روایات سے کلینت بناوت کرنے کا۔ یہ دونوں خرابیاں دراصل نتیجہ ہیں پہلی برائی کا۔ یہ کبھی کبھی یہاں تک سوچنے لگتا ہوں کہ کسی قسم کے جاہلی رد عمل میں پڑ کر غلط روش اختیار کرنے کے بجائے کوئی شعور رکھنے والی خود دار لڑکی سوال کرنے والے ”وکیل“ سے صاف صاف کہہ دے یا نکاح خان کو پرچہ لکھ کر بھیجے اور کہہ دے کہ یہ صورت مجھے منظور نہیں ہے اور میں شریعت کے دیئے ہوئے حق کو استعمال کر رہی ہوں۔ مغربی طرز کی آزادی نسوان کی تحریکیں چلنے والی جگہات کے مشغول کی سطح دوسری ہے۔ اس عام سطح کے مظالم کا مقابلہ کرنے کے لیے لڑکیوں کے اندر صحیح اسلامی حقوق حاصل کرنے کی تحریک چلنی چاہیے۔

میں اپنی ان گزارشات کے لیے اپنی جگہ دلائل رکھتا ہوں، مگر ضروری نہیں کہ ہر بات کو دوسرے قبول ہی کریں۔ ماں میں صرف ایک اصول کے متعلق اپنے ہم فکر دوستوں سے یہ ضرور اصرار کرتا ہوں کہ وہ ہونے والے زوجین کے صحیح اور حقیقی رجحانات کو مختلف طریقوں سے معلوم کریں۔ فیصلے کو التوا میں رکھ کر بار بار اس کے متعلق اندازہ کریں کہ یہ رضا کارانہ طور پر بلکہ دلی مسرت

سے قبول کیا جائے گا یا چار و ناچار۔

دراصل والدین اور اولیا کی اپنی بے شمار مصلحتیں ہوتی ہیں کہیں بڑوں کے دیرینہ حسن تعلقات کا تقاضا سامنے ہوتا ہے، کہیں کسی زمین کا لین دین اٹکا ہوتا ہے۔ کہیں کوئی بھاری قرض لیا ہوا ہوتا ہے یا لینا ہوتا ہے، کہیں کسی عزیز کو نوکری دلوانے کی راہ نکھوانی ہوتی ہے، کہیں کاروباری مفاد سامنے ہوتا ہے، کہیں سیاسی تقاضے دباؤ ڈالتے ہیں۔ مگر یہ سارے معاملات بڑوں کے اپنے معاملات ہیں۔ عین کی وجہ سے اولاد کی شادی کے معاملے میں نہ دلی میلان کی پروا کی جاتی ہے، نہ اُن میں تعلیمی ہم مرتبگی کو دیکھا جاتا ہے، نہ اُن کی عمروں کے تقاضات کا کوئی احساس ہوتا ہے، اور نہ اُن کی شکل و صورت اور عادات و اطوار کے عین فرق پر نظر جاتی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ بڑوں کے مصالح و مفاد اپنی جگہ، مگر وہ اولادوں کے ازدواجی مستقبل کو اُن کی قیمت میں دینے کا مستحق نہیں رکھتے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح و ازدواج کو سادہ اور آسان بنانے کی سعی بھی کی، تعلیم بھی دی اور عملی نمونہ بھی نہ صرف خود اپنی طرف سے پیش فرمایا بلکہ اپنے صحابیوں کی زندگیوں میں اس کی پوری شان سے پیدا کی۔

بخلاف اس کے ہمارے یہاں نکاح اور شادی کو ایک بارگراں بنا دیا گیا ہے۔ لوگ اجزا کو سنت کے تحت جواز دینے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس مجموعی کارروائی کے لیے جو وسیع سنت ہیں ملتی ہے، اسے قبول نہیں کرتے اور قبول نہ کرنے والوں کے پاس ہزاروں دلائل ہیں۔ یہ بھی کہ وہ غربت کا دور تھا۔ یہ بھی کہ آج کے ماحول کے کچھ نئے تقاضے ہیں، آج شادیوں کی تقریبیں سیاسی اور سماجی تعلقات بڑھانے اور معاشرتی مرتبہ بنانے کا بھی ذریعہ ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

شادی آج اس معنی میں بارگراں ہے کہ صرف دولت تو اسراف کی تمام حدوں کو توڑ ہی چکا ہے، اس کے ساتھ منائش دولت اور مظاہرہ دولت کی ایک اور بلا چٹ گئی ہے۔ نمائش دولت کا یہ فتنہ شادی کا رڈ سے لے کر بدی اور جہیز اور ولیمہ تک ہر جگہ رقص کرتا نظر آتا ہے۔

حالانکہ اصلاً شادی، نکاح یا ازدواج کا سارا کھیل اتنا ہی عفا کہ مجلس میں گواہوں کے سامنے

ایجاب قبول ہو، خطبہ نکاح پڑھا جائے، دُعا مانگی جائے اور ان مراحل میں ضرورت کی حد تک اعلان نکاح ہو جائے اور بس۔
مگر آج جس طرح کا تناشا ہوتا ہے اس کے چند پہلو عرض کیے جا رہے ہیں۔

اس دور میں شادی کا پہلا شگوفہ دعوت نامے یا شادی کارڈ کی شکل میں پھوٹتا ہے۔ آرٹ کے نادر سے نادر نمونے، کاغذ کی اعلیٰ سے اعلیٰ اقسام، کارڈوں اور لفافوں کی مختلف اشکالیں میں کٹنگ، رنگوں کی کہ شمشادیاں، ہم جیسے درویش مزاج لوگوں کے دل تو کارڈ دیکھ کر ہی دہل جاتے ہیں، نہ معلوم ایسے کارڈوں سے جو کھیل کھیل جاتے گا وہ خود کیسا ہوش رُبا ہوگا۔
پھر استادِ فرنگستان کی پسند کے عین مطابق یہ کارڈ ”یگم و مسز فلان“ کی طرف سے جاری ہو گا یعنی گھر پر مہمانوں کو بلانے کے لیے صاحبِ خانہ اور قائمہ خانہ کا فریبنده ہونا کافی نہیں۔
شریف و سنجیدہ لوگوں کو سیدھی طرح یہ طے کرنا چاہیے کہ 5×3 (یا 5×4) سے بڑے سائز کا کارڈ کسی بھی صورت میں جاری نہیں کیا جائے گا۔ سیدھی طرح صاحبِ خانہ کی طرف سے دعوت دی جائے گی کارڈ سادہ قسم کے سفید کاغذ پر ہوگا اور بغیر کسی آرٹ ورک کے سیدھی سادی لکھی (سیاہ یا نیلی) تحریر میں چھپا ہوگا۔
یہ سے تبدیلی کا نقطہ آغاز!

شادی کی تقریب کو ایک بڑی کافر نس یا سینار بنانے کے لیے ہزاروں دعوت نامے رشتہ داروں اور دوستوں، سرکاری افسروں، ادیبوں اور شاعروں، اخباری شخصیتوں کے نام نہ صرف شہر میں بلکہ ملک بھر کے مختلف گوشوں میں پہنچائیے جائیں گے۔ حالانکہ لڑکے والے ہوں یا لڑکی والے، اتنا کافی ہے کہ چند قریبی رشتہ داروں کو بلایا جائے۔ چند اہم ہم پیالہ و ہم نوالہ دوستوں کو مدعو کر لیا جائے۔ اور بقیہ حلقہ تعارف کو اگر خط طے جائیں تو اس معنوں کے ہوں کہ آپ اس تقریب کے لیے وقت، پیسے، جسمانی تکلیف اور کام کے ہرج میں نہ پڑیں، صرف تقریب کا کامیابی اور زینین کے حسنِ تعلق کے لیے دُعا فرمائیں۔

اب اگر ہر صحافی، ہر عالم، ہر ادیب، ہر سیاسی لیڈر، ہر سرکاری افسر اور تحریک اسلامی کا ہر نمایاں فرد یہ چاہے کہ وہ نیچے یا بچی کی شادی کی تقریب کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں ہم رنگ لوگوں کو جمع کر کے خاص طرح کے اثرات پیدا کرے گا تو اس طرح تو اصلاح احوال ممکن نہیں۔ قصبوں اور بڑے شہروں میں رہنے والے لوگ ہزاروں کا مجمع جمع کر لیتے ہیں۔ اور ان کی تقلید میں شہر کے متوسط الحال اور محنت کش بھی امکانی حد تک ایک ہجوم کا انتظام کرتے ہیں، پھر اس سے آگے دیہات کے جاگیردار اور وڈیرے تو الگ رہے، معمولی حالات کے لوگ بھی ایک انبوہ ہم کر لیتے ہیں۔

حالانکہ ایسی تقاریب بسا اوقات تو بارگراں میں بن جاتی ہیں۔ مثلاً پچھلے دو ماہ میں صرف اپنے شہر سے ہی مجھے ہر ہفتے کبھی ایک اور کبھی دو دعوت نامے موصول ہوئے۔ اب ان میں جا کر کوئی کس سے کیا سیاسی یا ادبی یا صحافی اثر لیتا ہے۔ ہر کسی کو جلدی پڑی ہوتی ہے، نکاح میں شمولیت کی یا ولیمہ کھایا اور رخصت۔ اللہ شہر خیر رکھے۔

مجھے اصرار ہے کہ بنیادی طور پر ان تقریبوں کو گھریلو اور خاندانی حد تک محدود رہنا چاہیے! دو چار افراد کو ہم مقصدی یا کسی خاص تعلق کی بنیاد پر بلایا جاسکتا ہے۔ مگر کوشش یہ کرنی چاہیے کہ لڑکی اور لڑکے والے دونوں گھروں میں ۵۰، ۵۰ سے زیادہ مہمان (مع خواتین) نہ ہوں۔ زیادہ بڑی قریبی برادری والوں کو کسی قدر ڈھیل مل سکتی ہے، مگر ایسی نہیں کہ وہ میلہ ہی لگا دیں۔

شادیوں کا ایک بڑا فتنہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں طرف یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے سسرال والے کیا دیں گے یا لڑکوں کی طرف سے بڑی کیسی آٹے گی۔ اور مہر کتنا ہو گا۔ اور لڑکی والے جہیز بھی کیا کچھ دیں گے۔ بلکہ شادیاں طے ہونے میں یہ سوال بہت دخل رکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ سچے مسلمانوں کے سوچنے کا یہ انداز ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ کجا یہ حال کہ آج کل ایک دوسرے سے مطالبے کیے جاتے ہیں، خصوصاً لڑکی والوں کو تو مجبور کیا جاتا ہے کہ اتنے تولے سونا اور فرچ اور ٹیلی وژن ضرور دینا ہو گا۔

اسی ذہنیت کو یکسر ختم ہونا چاہیے۔ اگر دونوں طرف سہ ماہی، اسلامییت ہے اور دولت شرافت

ہے تو پھر کسی فریق کو دوسرے کے متعلق نہ خاص اُمیدیں رکھنی چاہئیں، نہ مطالبے کرنے چاہئیں، اور نہ ساری عمر لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے کو، اور نہ لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی اور اس کے والدین کو یہ طعنے ملنے چاہئیں کہ تم لوگوں نے تو حق ادا کیا ہی نہیں، وغیرہ۔

اس معاملے میں دونوں طرف غیرت و محبت اور بے نیازی و خودداری ہونی چاہیے۔ جو کچھ لڑکے والوں کی طرف سے از خود ہو سکے وہ قبول، اور اس طرح لڑکی والوں طرف سے رضا کارانہ اور مخلصانہ جذبے سے جو کچھ ہو سکے وہ منظور۔

بلکہ دونوں فریق ابتدا ہی میں ملی کر یہ بات ہمدردانہ جذبات سے طے کر لیں کہ بھائی نہ اپنے اوپر بے جا بوجھ ڈالنا اور نہ قرین لینا اور نہ ہر اُسے نمائش کوئی کام کرنا۔ اور یہی مشورہ دوسری طرف سے ہو۔ جو کچھ جس کے بس میں ہو وہ وہی کچھ کرے۔ جیسا کھانا دے سکتا ہے، دے۔ اور جیسا سامان وہ فراہم کر سکتا ہے، کرے۔ دونوں طرف صاف دلی سے اپنے اپنے گھروں کے تمام لوگوں کو اس پر پہلے سے مطمئن کر لیں کہ ہمارا اصل مقصد رشتہ دربط ہے، کسی دنیوی مفاد کو کہنا مطلوب نہیں ہے۔

کتنی ہی ہماری بہنیں اور بیٹیاں شریف دینی گھرانوں میں باوجود تعلیم اور شکل و صورت اور خانہ داری کی مہارت کے کنواری بیٹی بیٹی بڑھ چکی ہو جاتی ہیں، مگر ان کو معاشرہ اس امر کی سزا دیتا ہے کہ تنہا والدین اور تم اتنی مقدار میں جہیز فراہم نہیں کر سکتے۔

میں پوچھتا ہوں کہ ہم میں کتنی مثالیں ایسی ہیں کہ اس طرح کی دردناک صورتوں میں کسی مظلوم بچی یا خاتون کی دستگیری باوجود خوش حالی کے، اور باوجود دولت مند گھرانوں سے رشتے ملنے کے، کی گئی ہو۔

اس طرح دوسری جانب یہ عبرت انگیز نقشہ بھی موجود ہے کہ کسی غریب مگر نیک نہاد اور قابل نوجوان کو کوئی گھر اس لیے قبول نہیں کرتا کہ وہ کوئی بڑا مہر نہیں دے سکتا یا شاندار بڑی نہیں دے سکتا۔ یا الگ رہنے کے لیے اپنا مکان نہیں بنا سکتا۔

یقیناً یہ کہ لوگ اسلامیت اور شرافت اور پردہ داری کے بالمقابل بالکل تارکِ دین اور غلامانِ مغربیت و اشتراکیت تک سے قاصر ہو جا رہے ہیں۔

کوئی اپنے بلند معیارات سے نیچے اترنے پر تیار نہیں ہے، کوئی اپنی مالی سطح سے نیچے نگاہ بھی نہیں ڈال سکتا۔ اور کوئی اپنے گھرانے سے باہر جھانکنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اور اسلام دور کھڑا یہ سارا نشانہ دیکھتا رہتا ہے۔ قیمتی ہیں وہ چند افراد جنہوں نے ان سلاسل و اغلال کو توڑ کر اسلامیت کے علم کو بلند کیا ہے! فکثرو اللہ امتثالہم۔

میری نگاہ سے کفو کا مسئلہ اوجھل نہیں ہے۔ اس کی بھی ایک اہمیت ہے۔ مگر کفو کے مفہوم کو متعین کرنے میں فرق ہو سکتا ہے۔

کفو کے مسئلے کا صحیح مفہوم ان مناکحتوں کے تفصیلی مطالعہ سے اخذ کیا جاسکتا ہے جو خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں، اور پھر جن کا اعتقاد صحابہ کرام کے مختلف قبیلوں کے درمیان کرایا۔ ایک کلمہ و مقصد کے مہاجرین و انصار کے درمیان کفو کا وہ تصور وسیع ہو گیا جو دورِ جاہلیت میں انتہائی محدود تھا۔

بعد کے احوال و واقعات نے تبدیلیاں پیدا کیں۔ جب پیشے نسلاً در نسل چلنے لگے تو آسانی اسی میں سمجھی گئی کہ کاشتکاروں کی اولاد، نور بافوں کی اولاد، کفیل دوزوں یا بگل گروں کی اولاد اور اسی طرح عاملوں یا مولویوں کی اولاد اگر اپنے ہی جیسے گھروں سے مربوط ہو تو ذوق و عادات کی ہم آہنگی اور گھروں میں بولی جانے والی اصطلاحات اور مخصوص قسم کے رواجوں اور روایات کا فہم سہل تر ہو گا۔

اوپر سے ستم یہ ہوا کہ ہمارا پالا ہندو سوسائٹی سے پڑا جو چار حقوق میں تقسیم تھی اور ہر حصے کے فرائض جدا جدا تھے۔ لہذا ہر حصے کے لوگ اپنے ہی سلسلے کی برادریوں میں جگہ پاسکتے تھے۔ اس حالت کو پہنچ کر ہمارے دن کفو کا تصور اور بھی بوجھل پیچڑن گیا۔

لیکن آج جب کہ مختلف پیشوں اور مشغلات کی تسلسلہ درجہ برہم ہو چکا ہے، تعلیم اور عہدوں نے پرانے خاندانوں سے اٹھنے والی اولادوں کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کفو کے مسئلے پر نظر ثانی کی جائے۔ کفو کی اصل حقیقت یہ ہے کہ دو گھروں کے درمیان جب ہم ہوں تو ان کی تعلیم، ان کا ذوق، ان کا مقصد، ان کی عادات اور ان کے طور طریقے یکساں نہ ہونے کی وجہ سے پیدا کرنے

میں نہ ہونے چاہئیں۔ نیز دونوں طرف کے خاندانوں میں بھی مغائرت کی کوئی خلیج حائل نہیں رہتی چاہیے۔
 میں یہ سمجھتا ہوں کہ اسلامی مقاصد کے لیے کام کرنے والے تعلیم یافتہ، شریف اور باعزت
 زوجین دوسری صورت کے مقابلے میں ہزار گونہ زیادہ اسباب ایسے رکھتے ہیں جن پر کفو کا
 اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

ایسے ہم عقیدہ و ہم مسلک لوگوں کو تو آغاز کار اس ادراک حقیقت سے کرنا چاہیے کہ حکم
 من آدم و آدم من ثواب۔

اب میں بارات کی تیاری کے مسئلے کو لیتا ہوں۔

رواج ہو گیا ہے کہ بڑی بارات لے کے جایا جائے اور رعب بٹایا جائے کہ ہمارا دائرہ اثر بڑا
 وسیع ہے۔ دائرہ اثر ہر ایک کا اتنا وسیع ہوتا ہے کہ وہ سو ڈیڑھ سو یا دو سو آدمی اکٹھے کر لے
 جائے، اور باراتوں میں بہت سے آدمی اکٹھے کر لینے کے معنی یہ بھی نہیں ہوتے کہ کسی طرف حقیقی رتبہ
 بلند یا سماجی مرکزیت موجود ہے۔ ہو بھی تو اس کی نائش کی کیا ضرورت۔ آپ دوسروں (جو حقیقت
 اپنے ہی ہیں) کے سر زیادہ بوجھ ڈال کر فخر کیوں محسوس کریں۔

پھر ایک ناشادو بہا کے ہار سنگھار کا ہوتا ہے۔ پہلے طے والے کئی ہار پھراؤ پر نوٹوں کے ڈالے
 کہیں ایک ایک روپے والے نوٹوں کے ڈالنے بنائے خریدے جاتے ہیں، کہیں دس دس روپے والے
 اور کہیں سو سو روپے کے نوٹوں کے۔

یہ تو گریا صریح طور پر اظہار ہے وافر دولت کا، یعنی دولت اچھل رہی ہے، ابلی پڑتی ہے،
 بالعموم اس قسم کے ہار کم پڑھ سکے، کا دوبارہ لوگوں میں رائج ہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی کلر کے اور
 جعدار تک پہنچا کرتے ہیں اور یا پھر مشرق وسطیٰ سے کماٹی کر کے لانے والے محنت کشوں کے
 گلے میں دولت کے یہ بندھن زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔

ممبئی اگر دولہا کو عام بارات سے ذرا سانپا یاں ہی رکھنا ہے تو گلاب کے پھولوں کا ایک ہار

لے اس مقصد کے لیے بڑی مقدار میں یہ نوٹ کھلی بلیک مارکیٹ میں لیتے ہیں۔

اس کے نگلے میں ڈال دو، اور بقیہ بارہائیوں کو موتیے کا ایک ایک ہار دے دو۔ ضرورت کے لیے نرائنا کاٹی ہے۔ اگرچہ میں نے حال ہی میں ایک ایسی مثالی شادی کی مثال اور مختصر بارہات بھی دیکھی ہے کہ دو لہا تک ہر قسم کی خصوصی آرائش سے بے نیاز مضامین - واہ وا !

پھر دو لہا کی کارہ سمجھتی ہے۔ اس کے لیے ہلٹے کی بھی اور پھولوں کی بھی ایسی جالیاں بکتی ہیں جو کاروں کو ”پہنا“ دی جاتی ہیں۔ حالانکہ اگر کار کو ضرور دنیا یاں ہی کرنا ہو تو اس کے سامنے کے شیشے کے اوپر کی جانب پھولوں کا ایک ہار، یا گوٹے یا گلے کی ایک سادہ سی لڑی کافی ہے۔ اسے محض ایک علامت کی حد تک رہنا چاہیے۔

مجلس نکاح کا انعقاد بالعموم محلے کی قریبی مسجد میں ہو تو افضل ہے، ورنہ کسی اور قریبی کشتہ جگہ پر نشست کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ مجلس نکاح کے عام شرکاء کی تواضع زیادہ سے زیادہ کسی ٹھنڈے مشروب یا چائے کی پیالی سے کر دینا کافی ہے۔ کھانے کا انتظام صرف بارہات کے لیے ہو اور بالکل حد استطاعت میں۔ لیکن کھانے پینے کے تمام انتظامات خواہ لڑکی والوں کے ہاں ہوں یا لڑکے والوں کے ہاں (خاص طور پر ویدیم، بیکریز، بوفے، سسٹم پر نہ کیے جائیں۔ یہ اسی تہذیب اعتبار کی ایجاد ہے جس کے خلاف ہماری معمولی لڑائی ہے۔ اس کے طور طریقوں کی تقلید سے انتہائی طور پر اجتناب کرنا چاہیے۔ جو لوگ کرسیوں کا انتظام نہ کر سکیں وہ دیاں بچھالیں، جہاں ایک ہی مرتبہ سارے حاضرین کی تواضع ممکن نہ ہو (حالانکہ ۵۰، ۵۰ ٹیبلٹ لائٹیں لگی ہیں۔ عمارت کی دیواروں پر لگے ہمارے ہاں قدیم دستور رہا ہے۔ ان لوگوں کے تو ذہن ناقابل فہم ہیں جو ہزاروں روپے دوسرے امور پر خرچ کرنے کے بعد صرف کرسیوں یا دریوں کا بلوچہ نہیں اٹھا سکتے (ہائے سچا رہے مفلسین قوم!)

لڑکے والے گھر میں زور شور سے اور لڑکی والے گھر میں کسی قدر کم پیلنے پر روشنیوں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ لوگ حد کر دیتے ہیں۔ ۵۰، ۵۰ ٹیبلٹ لائٹیں لگی ہیں۔ عمارت کی دیواروں اور درختوں اور جھاڑیوں کو چھوٹے چھوٹے رنگدار بلبوں کی کثیر تعداد سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ بسا اوقات روشنیوں کی لمبی قطار در در مڑ کر تک جاتی ہے۔ اسی کے ساتھ جھنڈیاں لہراتی ہیں۔

میں نے خود دیکھا کہ ایک کوٹھی پر تین چار دن تک رنگ برنگی روشنیوں کو اس طرح آراستہ کیا گیا تھا کہ شاید ہی کوئی انچ جگہ خالی ہو۔ ایسے مناظر کیا روٹی اور دوا سے محروم غریبوں کا خون نہ کھولا دیتے ہوں گے۔ بجلی کی کمی کا ماتم تو الگ رہا۔

زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ کام کرنے یا مہمانوں کو ٹھیرانے یا کھانا کھلانے کی جگہ اعتدال سے روشنی کا انتظام کیا جائے۔

ہم لوگ جس دولت کو اس طرح اڑا دیتے ہیں کیا یہ دوسروں کی حق مار ہے نہیں ہے اور کیا ہمیں پیسے کا حساب آخرت میں نہیں دینا ہوگا۔ کیا دنیا اندھیر نگری اور دولت ایک خزانہ یعنی ہے کہ جس کا جتنا جی چاہے لوٹ لے اور پھر اس کو چاہے تو دور یا بُرہ دکر دے، چاہے تو آگ لگا دے۔ جی نہیں! یہ خدا کے خزانے کا مال ہے اور اس کے ہر ذرے کا حساب دینا ہوگا۔

پھر کہیں بارانوں کے ساتھ مینڈ باجے اور گولے پٹاخے ہیں اور کہیں لڑکے والوں کی طرف ساعت شکن وامبیات ریکارڈنگ کا طوفانی شور ہے اور لڑکی والوں کی طرف ”گھر سے تھالی“ اور ڈھولک کے پاکیزہ گھر بلوگیتوں سے معاملہ آگے بڑھ کر ”اپنا“ والی ثقافت تک جا پہنچا ہے کچھ فلمی بول بھی ہیں، کچھ دھمال لڑی بھی ہے، فن کی ماہرات بھی جاشا مل ہوتی ہیں بلکہ بلوائی جاتی ہیں۔

گویا شادی نہ ہوئی کوئی سلطنت فتح ہو رہی ہے اور اس کا جشن منایا جا رہا ہے۔ اسلام میں تو ایسا جشن بھی سجدہ عبودیت سے منایا جاتا ہے۔

یہ مسلمان جن کے آدھے بھائی افغانستان اور فلسطین، لبنان اور شام، بھارت اور حبشہ، فلپائن اور افریقی ریاستوں میں ہزار در ہزار ذبح ہو رہے ہیں اور آدھے بھائی مہاجر بن کر دنیا کے متعدد کمپوں میں پڑے ہیں، اور جن کے ایک طرف روس اور دوسری طرف بھارت جدید اسلحہ سے لیس کھڑے ہیں۔ ان کی دلچسپیوں اور مشاغل کا یہ حال ہے۔

ان ساری لغویات کو چھوڑے بغیر اہل و احد کی عبادت اور اس کے دین کی سر بلندی کا کام

نہیں کیا جاسکتا۔

شادیوں میں لڑکے اور لڑکی والوں کے گھروں میں چاہے کچھ پردہ بھی ہو، مہمان خواتین کی وجہ سے بے پردگی کی پیاد آتی ہے کہ لباسوں کی رنگینی اور زیورات کی چمک دمک اور میک آپ کی قبر مافی کا طوفان دین و اخلاق کی ساری قدروں کو بہالے جاتا ہے۔ میں نے ایسے جو منظر دیکھے ہیں ان کی وجہ سے تقاریب نکاح کی کلاہت دل میں بیٹھ گئی ہے۔

شریف دیندار لوگوں کو نہایت جوأت کے ساتھ دعوتی کارڈ کی پشت پر ضروری گزارشات میں یہ بھی لکھ دینا چاہیے کہ جو خواتین شریک ہوں، براہ کرم لباس اور زینتوں اور میک آپ کو چھپانے والے مکمل پردے کے ساتھ شریک ہوں اور مردوں میں گھسنے اور دروازے سے بار بار جھانکنے سے پرہیز کریں۔ یہ بات محذوف ہی رہنے دی جائے کہ من سے یہ پابندیاں نہ اٹھائی جاسکتی ہوں وہ معاف ہی رکھیں۔ اور اپنے تعلقات کے تقاضے کسی دوسرے وقت پردے کر لیں۔ کیونکہ کسی گھر میں ایسی خواتین کی چلت پھرت مہمانوں اور محلے داروں پر بھی یہی اثر چھوٹے گی کہ یہ تارکین پردہ کا گھر ہے۔

جس ملک میں پردے کے خلاف امریکہ اور اسرائیل اور روس کی تہذیب نے یہ جنگ چھیڑ رکھی ہو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تلقین کردہ نظام پردہ کو ختم کرنا ہے، وہاں دوسروں کے لیے اس طرح کی غلط فہمی کا ناستہ کھولنا بھی خطرناک ہے۔

یہاں ایک افسوس ناک حقیقت کا ذکر ضروری ہے کہ بہت سی صورتوں میں دولہا کی جانب سے شادی کے وقت یا کچھ دیر بعد لڑکیوں سے پردہ ترک کرنے کی شرط منوائی جاتی ہے اور اس شرط کے سامنے ایسے والدین اور ان کی بیٹیاں تک سر جھکا دیتی ہیں جنہیں اسلامیت اور پردہ داری کے لحاظ سے معروف مقام حاصل ہوتا ہے۔ پردہ کے خلاف ابلیسی جنگ کے ایسے ایجنٹوں کا مقابلہ کرنے کی ہمت پیدا کرنی چاہیے۔

بیچ میں ہندی اور تیل وغیرہ کی رسموں اور ان کی مقررہ شریعت کا معاملہ رہا جانا ہے۔ یہ سب

فضول باتیں ہیں، ہندو تہذیب کے اثرات ہیں، ان کو چھوڑ کر بغیر کسی تقریب کے مہندی کا انتظام کیا جاسکتا ہے۔ خود لڑکی والے اپنی طرف سے بھی کر سکتے ہیں اور لڑکے والوں کو بھیجنی چاہیے تو وہ بھی ایسے چوڑے چکروں کے بغیر بھیج سکتے ہیں۔ تیل وغیرہ کو چھوڑیئے، لایعنبات کا سلسلہ لمبا نہ کیا جائے۔

اب بیجیے، مہر کی بات !

لڑکی والوں کا رجحان یہ ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی رقم کا مہر باندھیں اور وہ لڑکے کی حیثیت سے بڑھ چڑھ کر ہی ہوتا ہے۔ دس ہزار، پچاس ہزار، ایک لاکھ، عزم کر جس معاشی مرتبے کا لڑکا ہو اس کے مطابق مقدار مقرر کی جاتی ہے، بلکہ ضد کی جاتی ہے، جھگڑے کیے جاتے ہیں، کبھی تو اس پر رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ دراصل لڑکی والے سمجھتے ہیں کہ یہ ایک رستہ ہے جو وہ ہونے والے داماد کے گلے میں ڈال کر اسے اپنے قابو میں رکھ سکتے ہیں اور اس رستی کا سرا لڑکی کو بھی تھا سکتے ہیں۔ حالانکہ بھاری مہروں نے نہ کبھی ٹوٹے نکاحوں کو بچایا ہے اور نہ پھلنے پھولنے والے نکاحوں کو کم مہروں نے ناکام کیا ہے۔ مہر ہی نہیں، خرچے لکھوانے اور بعض شرائط منوانے تک بات جاتی ہے۔

دوسری طرف لڑکے والے ہیں جو اس سودا بازی میں کم سے کم قیمت پر تو بات کو لانے کی کوشش کرتے ہی ہیں۔ اکثر اوقات ایک آواز شرعی مہر کی بھی سننے میں آتی ہے اور اس کی مختلف مقداریں اہل تادیل نے متعین کی ہیں۔ حالانکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جہاں کھلے دل سے اپنا اعزاز سمجھ کر لڑکے والے اغنیاء نے بڑے بڑے مہر خوشی خوشی مقرر کیے ہیں، داں ایک طرف خود حضورؐ کی طرف سے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دیا ہوا سادہ سا جہیز ایک دلکش نمونہ ہے۔ دوسری طرف صحابہ کرام کی شادیوں کے مہر ایسے بھی مقرر ہوئے کہ شوہر اپنی بیوی کو علم سکھا دے گا، یا پیغام دینے والا امیدوار اسلام لے آئے گا اور اسلام لانا ہی اس کا مہر ہوگا۔

بدیں وجہ مہر کے متعلق کوئی ایسا قطعی منصوص اور صحابہ میں معمول بہ مہر نہ تھا جسے اب صدرِ صاحب

ہر ایک تو رستہ کشی سے مقرر نہیں ہونا چاہیے، بلکہ شخص متعلق کی حیثیت کے مطابق اس کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہیے تاکہ وہ اگر زیادہ ہر مقرر کرے تو اسے اپنا اعزاز سمجھ کر مقرر کرے عموماً لوگوں سے حسن سلوک کا بہترین معیار قائم کرنے والے مرد بھی بہترین کردار کے ہوتے ہیں۔

دوسرے ہر صرف شادی کے وقت کی مالی حالت کی بنیاد پر ہی مقرر نہیں کیا جاتا، بلکہ مستقبل قریب کے معاشی امکانات کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے اور ایک مرد کی نگاہ کو دور تک جانا چاہیے۔ آخر اور کاموں کے لیے وہ مستقبل کی اُمید پر قرض لیتا ہے تو نکاح ہی کے لیے مستقبل کی اُمید پر ہر غیر معجل کی مقدار کیوں زیادہ نہیں رکھ سکتا۔ مکان بنانے اور گاڑی خریدنے کے لیے تو سود پر بھی قسطوں والے نظام فروخت میں ذمہ داری اٹھائی جاتی ہے، آخر بیوی ہی کو اقتصاد میں کیوں ادائیگی نہیں کی جاسکتی۔

لڑکی والوں کی بھی اسلامیت اور شرافت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ہر کو مرد کے لیے ایک لگام اولہ رستے کی نیت سے استعمال کرنے کا ذہن ہرگز بیچ میں نہ آنے دیں۔

کسی مرد کا دیندار، شریف اور شائستہ الطوار ہونا ہی اس کا سب سے بڑا مہر ہے۔ اسی طرح ہجری کے معاملے میں بھی سارا معاملہ مرد یا اس کے خاندان پر چھوڑ دینا چاہیے۔

مہر کی بات آئی تو یہی معاملہ جہیز کا بھی ہے۔ کسی شخص یا خاندان کا یہ سوچنا کہ ایک لڑکی (یا اس کے والدین) اس کا گھر بھرے اور شادی ایک معاشی مسئلہ اور کمائی کا ذریعہ بنے، مرد کے لیے تو ڈوب مرنے کی بات ہے۔ اگرچہ اخلاقی انحطاط کے موجودہ دور میں چلو بھرنی پانی میں ڈوبنے والے نہیں رہے۔ بلکہ تالابوں اور سمندروں کے پانی میں تیراکی کرنے والے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، مگر چھٹی مردانگی کا ایک عزم و وقار ہے۔ اس کا مقام غیرت و خود داری ہے۔ وہ (یا اس کے گھر والے) انتہی گری ہوئی بات کہنے پر آمادہ ہی کیوں ہوں کہ آنے والی لڑکی کے لیے لازم ہے کہ وہ دولت کا ایک طوفان اور سامانوں کا ایک انبار لے کے آئے۔ مردوں میں یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ ہم کپڑے اور زیور سے لے کر فرنیچر اور برتنوں تک اور سامانِ آسائش سے لے کر سامانِ آرائش تک سب کچھ حسبِ منشا خود فراہم کر دیں گے، مگر فریقِ ثانی کے سامنے یہ سوال یا مطالبہ رکھنا کہ

ہیں یہ کچھ اور اثنا اتنا دیا جائے۔ ایک طرح کی گداگری ہے۔

یہ لوگ بات ہے کہ تمام والدین اپنی لاڈلی بچیوں کے لیے کچھ نہ کچھ سروسامان کرتے ہیں اور کرنا چاہیے۔ لیکن حالاتِ زمانہ سے مجبور ہو کر اتنا خرچ کرتے ہیں کہ بسا اوقات قرض اٹھا کر بعد میں بڑھاپے کی زندگی نہایت مشکلوں سے گزارتے ہیں۔

لڑکے والوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ اپنا ہی ایک دوسرا گھر مصائب سے دوچار ہو، یا قرض کی وجہ سے ذلیل و خوار ہو۔ یہ حالت تو رحم کھانے کی ہے۔

جہیز کے معاملے میں (بڑی کی طرح) ایک مصیبت یہ ہے کہ اس کی نمائش بے حد ضروری ہے ماں بڑے فخر و ناز سے دکھاتی ہے کہ اس نے کیا کب زینور بنوائے ہیں، کتنا سونا خریدا ہے، کپڑوں کو چھپلا کر دکھاتی ہے کہ ان میں بیشتر جوڑے ”بابر کے“ ہیں، ورنہ اگر پاکستانی کپڑے کے ہوں تو ناک نہ کٹ جائے اور سسرال والے بگڑ نہ جائیں۔ پھر برتن، صوفہ سیٹ، دودو پلنگ، چار چار بستر، اس سے آگے بڑھ کر فرج اور ٹیلی وژن، ورنہ کم سے کم ریڈیو سیٹ، پریشر کک، برقی استری، واٹر کولر، ڈنر سیٹ، واٹر سیٹ، چائے کے سیٹ کافی کے سیٹ، فروٹ پیش کرنے کے سیٹ، ڈرائی فروٹ رکھنے کا سامان، دولہا دلہن کے لیے گھڑیاں، پچھلے سنہری کام کے جوڑے، کشیدہ کاریاں، سردی کے خاص لباس — غرضیکہ ایک صحن میں پورا انا رکی سا جاتا ہے۔

اوپر گھرنے کا ریس کرنے والی یہ مائیں پچھلے کئی کئی سال اپنی اولاد بچوں کی غذائی اور دوائی ضروریات میں کمی کرتی ہیں، پھر قرض چڑھا کر اُسے اتارنے کے لیے طرح طرح کی مشقتیں کرتی ہیں حتیٰ کہ ان کی پوری زندگیوں کا پتہ دوا ایک لڑکیوں کے جہیز کی چکی میں پس جاتا ہے۔ مگر خود پرست انسانوں کو ان پر رحم نہیں آتا۔ کیونکہ ان کے مقابلے پر کوئی دوسری مائیں زیادہ مال و متاع لیے موجود ہوتی ہیں۔ یہ فری کبھی ٹیشن کی مارکیٹ ہے۔ اس میں اخلاف کا سکہ نہیں چلتا بلکہ مال کی قدر مانی جاتی ہے۔

جہیز کے متعلق کسی حالت میں دوسرے فریق کو مطالبہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ قرض یا معاشرتی مصیبت جھگڑنے سے بچنا چاہیے۔ جہیز جو کچھ بھی ہے، حالات کے مطابق سہولت سے بنے خوشی سے لیا

جائے، دکھاوانہ کیا جائے (نہ اس گھر میں نہ اس گھر میں)، اور کبھی ساری عمر جہیز کی کمی کا ماتم نہ کیا جائے۔ اور لڑکی یا اس کے والدین کو طعنے نہ دیے جائیں۔

یاد رکھیے کہ کسی مجبوری بھالی پردہ پسند دیندار لڑکی کی عصمت و عفت اور اس کی نگاہوں کی پاکیزگی اور دنیا کی لذتوں اور کھیل تماشوں سے بے نیازی ایک ایسی گمان بہا متاع ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا جہیز ان چیزوں کی کمی کو پورا نہیں کر سکتا۔

پاک و دامن لڑکیوں کا مرتبہ اتنا بلند ہے جو لوگ شوخ و شنگ محفل گرد حسیناؤں کے ڈسے ہوئے ہوتے ہیں وہ ساری عمر نسوانی پاکیزگی کو ترستے رہتے ہیں۔

شادی بیاہ کے سلسلے میں ولیمہ بھی ایک بڑا غور طلب اور اصلاح طلب موضوع ہے۔ ولیمہ کا کارڈ بھی اگر الگ سے جاری ہو تو وہ بھی (پہلے ذکر کردہ دعوت نامے کی طرح) سادہ ہونا چاہیے۔ ولیمہ میں کتنی کتنی کھانوں اور پھلوں کا انتظام کر کے شانِ امارت دکھانے کی ضرورت نہیں۔ متوسط طریقے سے سیدھے سادے دو ایک کھانے ہونے چاہئیں۔ ولیموں میں زیادہ تعداد دونوں طرف کے رشتہ داروں کی ہو، تھوڑے بہت احباب بھی شامل ہوں، مگر ہدایت نبوی کے مطابق ایک تعداد غریب طبقے کے یر و مسکینوں کی بھی ہو۔ انہیں بھی عزت و آبرو سے بٹھا کر مناسب انداز سے کھانا کھلایا جائے بلکہ اگر خوش حال لوگوں کے سامنے ہی انتظام ہو تو ان میں طبقاتی تفاوت کے احساسات کو نشوونما نہیں ملے گی۔

آج کل تو ایسے ایسے ولیموں کا انتظام ہوتا ہے جیسے دورِ عباسی میں ملکہ خیزران کی شادی کا اہتمام ہو رہا ہو۔

خدا کے بندو! بندگی و مسکینی کی سلج پہ اپنے آپ کو لاؤ۔ اور شادی کے ہر مرحلے کو نمائشِ دولت کا ذریعہ نہ بناؤ۔

جسے خدا نے ضروریات سے زائد دولت دی ہے وہ اس میں شادی بیاہ کے موقع پر زیادہ سے زیادہ حصہ غلبہٴ اسلام، تبلیغِ دین، تعلیمِ قرآن، یتیموں، یتیموں، بیواؤں اور معذوروں کی بہبود اور رفقیانِ حق و حیزام کے علاج کے لیے صرف کر کے ایک مثال قائم کرے۔ اور نہیں تو کم سے کم اتنا تو ہو کہ شادی

کے فریقین اپنے اپنے خرچ کا پانچواں یا دسواں حصہ اتفاق فی سبیل اللہ کے لیے متعین کر دیں۔

آخری بات مجھے یہ عرض کرنی ہے کہ مخالف اور سلامیوں کا سلسلہ بھی اب جلد محدود کو پھیلانگتا جا رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اندرونِ خانہ کے محدود حلقہٴ اعزہ کے سوا سب کو اس طرح کی تکلیف سے روک دیا جائے۔ ایک تو لوگ شوکت کے لیے وقت اور مصروفیات کی قربانی دیں، اُدپر سے مخالف کا انتظام بھی کریں اور اس میں بھی اظہارِ قربات و خلوص کا مقابلہ کر لیا چیز دوسروں سے بلکہ کے نادر محسوس ہو۔

اس طرح سلامیوں کا سلسلہ اب پچاس اور سو روپے کی حدوں سے بھی تنجاؤ کر کے پانچ پانچ سو روپے تک پہنچ گیا ہے۔ بعض مثالیں ایسی بھی میرے علم میں آئیں کہ لاکھ روپیہ تک سلامی میں ایک پاٹنی رکھتی ہے۔

سلامیاں وغیرہ بھی قریبی گھر علیہ رشتہ داروں میں اعتدال سے چلیں اور اگر کسی کو دس پانچ روپے کی توفیق ہو تو اُس کی طرف سے اسی کو علامتِ خلوص سمجھا جائے۔

شادی ہو چکنے کے بعد ازدواجی زندگی کی خوبصورت اُٹھان ہی وہ اصل پیر ہے جس پر توجہ دی جانی چاہیے۔ مرد کی ذمہ داری ہے کہ وہ عورت کو جادۂ حیات کی ہم سفر اور رفیقِ منزل سمجھے، نہ یہ کہ ایک خادمہ یا لونڈی حاصل ہو گئی ہے۔ جس کی نسائی فطرت کی وجہ سے اسے ہر وقت غیظ و غضب، طعن و طنز اور بد اعتمادی اور سوتے ظن کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ عورتیں مردوں کے پاس خدا کی طرف سے ایک امانت ہیں۔ ان کے ساتھ بلا وجہ بدسلوکی اور بدگوئی کا رویہ کسی مسلمان کا نہیں ہو سکتا۔ یہ ذمہ داری بھی مرد ہی کی ہے کہ وہ اپنی ماں بہنوں کے احترام اور بیوی کی محبت کے حدود قائم رکھے اور کسی ایک طرف جھکا کر انتہا پسندی اختیار نہ کر لے جو بیوی کے حقوق اور معاملات ہیں ان میں حصہ کے دوسرے لوگوں کا کوئی دخل نہیں، جو ماں بہنوں کے حقوق ہیں اُن میں بیوی رُکاوٹ نہیں بن سکتی۔ اب یہ مرد کا اپنا کام ہے کہ الگ رہن سہن اگر میسر نہ ہو تو عدل کی تلوار کی دھار پہ اس توازن سے چلے کہ معاملے کو کسی طرف سے بگڑنے نہ دے۔ جہاں کہیں بیویوں کو شوبہ و شک کی طرف سے محبت اور

اعتماد اور منتظر حاصل رہتا ہے۔ وہاں ملے جلے گھروں میں کچھ زیادہ خرابی نہیں ہوتی۔ بصورت دیگر گھر پر سالوں سے چھائی ہوئی دو تین عورتیں جب ایک نئی عورت کو اس دائرے میں داخل ہوتا دیکھتی ہیں تو بالعموم اس کا جینا دو بھڑکے دیتی ہیں، سبب کہ شوہر صاحب ایک طرف سماعت رکھتے ہوں۔ ایسے گھوگھوٹا پٹ شوہر ساری ساری نندگیاں اپنے گھر کو امن و سکون سے محروم کر کے گنڈا رہتے ہیں۔ نہ خود آرام سے رہتے ہیں، نہ بیوی کے لیے چین اور نہ بچوں کے لیے سکون۔ محض دل کے یک طرفے سے پیدائش شدہ ایک مبہم احساس کے مہیب سایوں کو اپنے اوپر اور گھر کے اوپر مسلط رکھتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو یہ حکمت معلوم نہیں کہ شوہر ایک مدت میں بیوی کو گھر سے تیار کر کے تاراج کر دے اور بیوی کچھ عرصے میں اپنا شوہر تراشتی ہے۔ بعض دوسرے فرق کے لیے چھوٹے پڑتے ہیں اور بعض انداز اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ یہ کام گھر پر بارشلا سے نہیں محبت و اعتماد سے انجام پاتا ہے۔ یوں تو اب مشترک خاندانی نظام آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے، مگر جہاں باقی ہے وہاں لوگوں کو چاہیے کہ اپنی پُرانی روش کو بدلیں اور نئی آنے والی خاتون کو کھلے دل سے خوش آمدید کہیں اور اُسے اپنی طرف سے ہر ممکن تعاون دیں اور اس میں اعتماد پیدا کریں ورنہ اگر ہر وقت ٹیڑھی باتیں کی جائیں تو اس قدر کی حساس لڑکیوں کو اُس طرح اندھے صبر کے کوہ میں نہیں پیلا جا سکتا۔ جیسے پہلے ہوتا تھا۔ اب زمانہ وہ رہا ہے کہ شادی سے پہلے جن دو گھروں میں محبت تھی، شادی کے فوراً بعد ان دونوں میں محاذ آرائی شروع ہو جاتی ہے۔

شادی کی تجویز کرنے سے پہلے گھر کے نئے نقشے کے متعلق ہونے والے شوہر صاحب بھی اور ان کے والدین اور بھائی بہنیں بھی اچھی طرح سوچ لیں۔ یہ ہے اصلاحات کا خاکہ جو میرے ذہن میں ہے۔

جیسا کہ اوپر میں نے کہیں لکھا ہے کہ بعض خدا پرست اور تحریک اسلامی کے فدائی اور کارکن زندگی کے معاملات میں غلط طریقے اختیار کرتے ہوئے یہ غلط پیش کرتے ہیں کہ بیوی نہیں مانتی، بچے ساتھ نہیں دیتے، یہ بردہ درمی اتفاق نہیں کرتی۔